مولانا ابوشاھد

مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ

سیرت کی چند جھلکیاں

سیرت ایک جوہر ہے جو انسان کے افعال و کردار میں نمایاں ہوتا ہے اس کی پرکھ ہمیشہ غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی زندگی کے شب و روز گزرتے رہتے ہیں اور زندگی اپنے سفر کے اختتام تک جا پہنچتی ہے لیکن نہ اس کے جوہر سیرت کی پرکھ کی گھڑی آتی ہے نہ سیرت کے حسن و کمال اور اس کی عظمت کا فیصلہ ہو پاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی زندگی میں اچانک ایک لمحہ نمودار ہوتا ہے اور اس کے جوہر سیرت کی عظمت کا فیصلہ کر جاتا ہے۔

انسان کا جوہر سیرت کوئی مجرد اور مفرد شے نہیں ایک کامل درجہ کی سیرت فہم و فراست، عزم و حوصلہ، فیصلہ و رائے، صبر و استقامت اور بذل و ایثار کے خصائص و محاسن سے تشکیل پاتی ہے لیکن ہم ان خصائص و محاسن کے کسی ایک پہلو کی دلربائیوں اور کرشمہ سازیوں سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تاریخ کامل درجہ کی سیرت کی مثالوں سے خالی نہیں لیکن عام طور پر ہمیں اپنے گرد و پیش میں جو شخصیتیں نظر آتی ہیں وہ بعض خصائص اور کچھ کمالات کی بنا پر ہمارے لئے مایۂ ناز ہیں۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی ہمارے شاندار ماضی کی ایک نامور شخصیت تھے۔ جو اپنی

سیرت کے بعض محاسن اور خصائص کی وجہ سے تاریخ میں نہ صرف خود ممتاز ہوئے بلکہ اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے بھی اپنی سیرت کا قابل فخر و تقلید سرمایہ چھوڑ گئے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے جوہر سیرت کی جستجو ہمیں ان کی زندگی کے اعمال و مشاغل کے مطالعے پر اکساتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں سب سے پہلے علوم اسلامی کے ایک مدرس کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں اس لیے پہلے ان کے جوہر سیرت کو درس و تدریس علوم و فنون اور تعلیم و تربیب اصحاب استعداد میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد ایک مناظر کی حیثیت سے ان کی شخصیت سامنے آتی ہے۔ یہاں ہمیں ان کے جوہر سیرت کو ان کے ذوق علم و مطالعہ، ان کی ذہانت و فطانت ان کے حافظہ و استحضار کے کمال، ان کے حسن بیان و استدلال، ان کی طلاقت لسانی اور خطابت میں ڈھونڈھنا پڑے گا۔ ابھی وہ دینی حمیت اور ملی غیرت کی آزمائش کے کے اسی دور سے گزر رہے تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک اور میدان نمودار ہوتا ہے۔ یہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وطن کی محبت، قوم پروری اور حریت نوازی کی آزمائش گاہ تھی ایک مدرس اور مناظر کے جوہر سیرت کی بڑائی اور بلندی کا فیصلہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ اس معرکہ میں بھی اس کے عزم و استقامت کو پرکھ نہ لیا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بدلے ہوئے حالات میں انکے جوہر سیرت کو اپنے ظہور و نمود کے لئے پھر کسی وجود عمل اور مظہر کی تلاش تھی۔ ان کی عظمت سیرت کے آخری فیصلے کے لئے ہم ان کی زندگی کے اس آخری دور پر بھی نظر ڈالیں گے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے تعلیم سے فراغت پائی تو انیسوی صدی عیسوی اپنا نصف سفر طے کر چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی معاشی خوش حالی کا دور گزر چکا تھا اور زبوں حالی کا دور دورہ تھا۔ مولانا مرحوم کا خاندان کسی جاگیردار اور سرمایہ دار کا خاندان نہ تھا۔ ان کے والد خلیل الرحمن[1] راجہ ہندو راؤ مرہٹہ کے ہاں منشی تھے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ رحمت اللہ

---

[1] مولانا رحمت اللہ نے اظہار الحق کے پیش لفظ میں اپنے والد کا نام خلیل الرحمن لکھا ہے۔ میں نے یہاں اسی کو اختیار کیا ہے۔ مولانا امداد صابری اور مولوی محمد تقی عثمانی نے خلیل اللہ اور مولانا سید محمد میاں اور پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے نجیب اللہ لکھا ہے۔ مولانا امداد صابری کی تحریر کے مطابق نجیب اللہ ان کے جد مرحوم کا اسم گرامی تھا۔ معلوم نہیں کہاں کتابت کی غلطی ہوئی یا کس سے تسامح ہوا۔ یہاں اس کی تحقیق ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

بھی اپنے والد کا دست و بازو بننے کے لئے کوئی ملازمت، تجارت یا کوئی اور ذریعہ معاش اختیار کرتے لیکن انہوں نے حصول مال کا ذریعہ اختیار کرنے یا کسی منصب کے آرزومند ہونے کے بجائے درس و تدریس اور ترویج علوم و فنون کی روایت کو آگے بڑھانے اور طلبہ کی تعلیم و تربیت کی خدمت کا فیصلہ کیا اور کسی انتظامی عہدے یا منصفی کی کرسی پر مدرسہ کی گوشہ نشینی اور بوریائے فقر کو ترجیح دی۔ درحقیقت یہ ان کا جوہر سیرت تھا جس نے حصولِ مال و عزت کے ذریعہ پر خدمت کو ترجیح دی اور ایثار و قربانی کی راہ کا انتخاب کیا۔

یہ زمانہ عیسائی مبلغوں کی سرگرمیوں کے عروج کا تھا۔ انتظامیہ پر چونکہ انگریزوں کا قبضہ تھا اس لئے ان کی کھلی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ عیسائی مبلغ گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں دندناتے پھرتے تبلیغ کرتے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو مناظروں کا چیلنج دیتے تھے ان کی ہمتیں اور منہ زوریاں بہت بڑھ چکی تھیں۔ ان سے مقابلہ و مناظرہ کرتے ہوئے اہل علم دبکتے اور جھجکتے تھے۔ عوام میں خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ مولانا رحمت اللہ کی دینی حمیت اور قومی غیرت سیرت کی اس پستی کو کبھی گوارا نہ کرسکتی تھی کہ دین اور ملت کے دشمن وطن عزیز کے گلی کوچوں میں دعوت مقابلہ و مبارزت دیتے پھریں اور وہ اس طرف سے آنکھیں موندکے فقہ اور فلسفہ و منطق کے پڑھانے میں مصروف رہیں۔ اس مسئلے کی سنگینی کا اندازہ وہ پہلے ہی کرچکے تھے اور ازالۃ الاوہام صفحات ۵۶۴) اور ازالۃ الشکوک (دو جلدیں صفحات ۱۱۱۶) کے نام سے دو ضخیم کتابیں لکھ کر چھپوا چکے تھے اس سے مولانا مرحوم کی مصنفانہ حیثیت اور مناظرانہ کمالات کا چرچا پورے ملک میں ہوگیا تھا۔ لیکن تحفظ دین اور دفاع ملت کے لئے وقت کی ضرورت تصنیف و تالیف سے زیادہ مناظرے کے عملی میدان میں مقابلے اور اوہام و شکوک کے ازالے کی تھی۔ یہی زمانہ تھا کہ پادری فانڈر کی فتنہ انگیزیوں اور افترا پردازیوں سے ملک میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ اور زمانہ کسی اسکندرِ وقت کی راہ تک رہا تھا۔ فانڈر کو شکست فاش دینا مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے ناصیہ مبارک میں لکھا ہوا تھا۔ یہ واقعہ اپریل ۱۸۵۴ء کا ہے کہ اکبرآباد مناظرہ و مقابلہ کا میدان قرار پایا اس نامی پادری اور ابلہ فریب عیسائی مشنری کو راہ فرار اختیار کرتے ہی بن پڑی۔ اس کے بعد بھی انہوں نے متعدد مناظروں میں حصہ

لیا جن میں مولانا رحمت اللہ کی سیرت علمی اور اسلامی غیرت اور حمیت کے خوب جوہر کھلے ملک سے بیرون ملک تک ان کے علم و فضل کے ڈنکے بجنے لگے۔ اور پادری مذکور پر غلبہ پانے اور فتح حاصل کرنے کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔

ابھی مولانا رحمت اللہ کا مستقر کیرانہ ہی تھا اور درس و تدریس کے علاوہ ان کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا تھا کہ ۱۸۵۷ء آپہنچا برٹش استعمار کے خلاف پورے ملک میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور اہل ملک نے استعمار کے اس کانٹوں دار درخت کو جس نے اہل وطن کے لباس کو تار تار اور جسم کو لہولہان کر دیا تھا۔ جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ استعمار کسی ملک میں ہو، کسی زمانے میں ہو۔ کسی شکل میں اس کے خلاف اسلام کے احکام واضح ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک ظہور اسلام اور بعثت نبویؐ کے مقاصد عالیہ میں قیصر و کسریٰ کے استعماری نظاموں کو توڑنا شامل تھا۔ اور خود انہیں الہام ہوا تھا کہ " فک کل نظام "، وقت کے ہر ظالمانہ نظام کو توڑ ڈالو۔ مولانا کیرانوی خانوادۂ ولی اللہی کے شجر طیبہ ہی کی ایک شاخ ثمر دار تھے ان کی سیرت کا یہ پہلو بالکل عیاں تھا چنانچہ مظفر نگر اور سہارنپور کے قصبات کیرانہ، دیوبند، تھانہ بھون وغیرہ کے قوم کے بہی خواہوں اور خادموں نے آپس میں مشورہ کیا اور مولانا رحمت اللہ کو حالات کا جائزہ لینے کے لئے دہلی روانہ کیا۔ دہلی ان کے لئے کوئی اجنبی شہر نہ تھا۔ دہلی میں ان کے اساتذہ تھے، ان کے شریک درس اور ہم سبق تھے، دہلی ان کے خاندان کے بزرگوں سے بھی خالی نہ تھی اور اب تو اس کے گلی کوچے مولانائے کیرانوی کی فتوحات اور ان کی سیرت کے تذکروں سے معمور تھے یہ وہ وقت تھا جب موقتہ حالات میں اسلام کا حکم اور مسلمانوں کے فرائض معلوم کرنے کے لئے استفتا تیار ہو رہا تھا اور پورا ملک خصوصًا مسلمان رہنمائی کے لیے علماء کی جانب تک رہے تھے۔ مولانا کیرانوی کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ انہیں نظر انداز کر دیا جاتا۔ فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے والے چونتیس علمائے کرام میں مولانا رحمت اللہ کا پانچواں نمبر ہے اور اس لحاظ سے تو ان کی سیرت کی بلندی کو کوئی مفتی اور دستخط کنندہ نہیں پہنچتا کہ انہوں نے

ممسوحة ضوئيا بـ CamScanner

فتوے پر دستخط کرکے مسلمانوں کو شریعت کا ایک حکم ہی نہیں بتایا تھا بلکہ اس وادیٔ پرخار میں عملاً بھی اہل ملک کی راہنمائی کی تھی۔

بالفرض انہوں نے فتویٰ جہاد پر صرف دستخط ہی کیئے ہوتے تب بھی ان کی سیرت کی عظمت کے لئے یہ کافی تھا۔ ان کا حصّہ تو عمل کی سعادتوں اور جہاد کے شرف میں بھی ہے۔

فتویٰ جہاد پر چند بوریہ نشینوں کا دستخط کر دینا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ ملک کی تاریخ آزادی کا ایک عظیم الشان واقعہ تھا ان بوریہ نشینوں کے سیاسی فہم اور ملی سیرت کی عظمت اور اہمیت کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ تاریخ حریت میں ان فقرائے اسلام کے مقام عزیمت دعوت کے تعیّن کے لئے شہنشاہ اکبر کے مخضر امامت پر دستخط کرنے والوں کی پستیٔ سیرت پر ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ تاریخ کا فیصلہ ان سگانِ دنیا کے بارے میں کیا ہے؟ کسی مسلمان مورخ اور اہل قلم نے صدیوں کے بعد بھی انہیں معاف نہیں کیا۔ پھر بتائیے کہ وقت کے ان اصحاب عزیمت دعوت کو مورخین نے تاریخ میں عظمت کا کون سا مقام دیا اور ان کے جوہر سیرت کو کن الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے؟

اس فتوے کی تالیف اور اس پر چند اصحاب کا دستخط کرنا صرف اس کے مفتیوں کی عظمت سیرت ہی کی دلیل تھی یہ استعمار کے خلاف اور ملک کی آزادی کے حق میں اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا اعلان بھی تھا۔

ہندوستان اس وقت علم والوں سے خالی نہیں ہوگیا تھا۔ خود مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے گرد و پیش میں مظفر نگر اور سہارنپور کے قصبات میں کئی فقیہ اور شیوخ موجود تھے لیکن ان میں سے کتنے تھے جن کے جوہر فراست نے سعی و عمل کے میدان میں ملک کی رہنمائی کی تھی اور عزیمت دعوت کی راہ پر چلنے کی جنھیں توفیق ملی تھی؟ جنہوں نے اپنی پست ہمتی کے لئے عذرات شرعیہ اور اصطلاعات فقہیہ کا سہارا لیا تھا۔ تاریخ نے ان کے چہروں سے نقاب الٹ دیا ہے۔ جو اصحاب عزم امور تھے ان کے مقدس

CamScanner

ناموں اور ان کے بے مثال کارناموں سے بھی دنیا واقف ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی انہیں اصحاب عزیمت میں سے تھے۔ دہلی میں فتویٰ جہاد کی تصدیق اور تائید اور حالات کا پورا جائزہ لے کر مولانا رحمت اللہ اپنے شہر لوٹ کر جاتے ہیں اور اپنے تمام ساتھیوں اور بڑوں کو حالات سے مطلع کرتے ہیں۔ اور پھر شاملی اور کیرانہ میں جہاد کا جو نقشہ ترتیب پاتا اس سے تمام اہل علم واقف ہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانہ کے محاذ کے امیر تھے۔ صبح و شام ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا "ملک خدا کا اور حکم مولانا رحمت اللہ کا"۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ملک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ افسوس کرتے ہیں لیکن یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ مجاہدین آزادی کتنے منظم تھے۔ انہیں کتنے وسائل جنگ حاصل تھے۔ جنگ کے ہتھیار ان کے پاس کتنے تھے، جنگ کی تربیت انہیں کتنی حاصل تھی۔ پوری قوم کی حمایت انہیں کس حد تک حاصل تھی۔ ان میں کتنے رجب علی، کتنے الٰہی بخش کتنے احسن اللہ اور کتنے سید احمد خاں تھے۔ بالفرض یہ تمام موانع نہ ہوتے تب بھی یہ کب ضروری تھا کہ آزادی کی اتنی عظیم الشان اور اتنے بڑے محاذ پر پھیلی ہوئی جنگ پہلے ہی ہلے میں کامیاب ہو۔

کیرانہ کی محاذ جنگ پر شکست کے بعد جب ملک کے سپوکوں، اور جنگ کے سورماؤں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو مولانا رحمت اللہ نے مردانہ وار ملک کے نام پر اپنی جان کی بھینٹ چڑھادینے کا ارادہ کرلیا لیکن ان کے بزرگوں نے انہیں روکا اور انہیں میدان سے ہٹ جانے کا مشورہ دیا۔ مولانا رحمت اللہ کا جوش سچا تھا لیکن سپہ سالار کی زندگی کی بہت اہمیت ہوتی ہے سپہ سالار ہو تو بچی کھچی فوج سے بھی کام لے سکتا ہے۔ سپہ سالار نہ ہو تو بڑی سے بڑی فوج بھی ایک بھیڑ ہوتی ہے اور بھیڑ سے فوج کا کام نہیں لیا جاسکتا انہوں نے بڑوں کا کہنا مانا اور انگریزوں کی نظروں سے چھپ گئے۔ اور نام بدل کر، بھیس بدل کر، چھپتے چھپاتے دہلی پہنچے۔ دہلی سے جے پور، جودھ پور ہوتے ہوئے سورت پہنچے اور سورت بندرگاہ سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ چلے گئے۔

سفر کا اندازہ ان سطور کی روانی اور سادگی سے نہ لگائیے۔ کیرانہ سے بندرگاہ سورت تک کا سفر پاپیادہ طے کیا تھا راستے میں جنگل پڑے، بیابانوں سے گزرے، ریگستانوں

CamScanner سوجه ضوئيا بـ

کی خاک چھانی، بھوک پیاس کی تکلیف اٹھائی اور دو چار دن اور ایک دو ہفتے کے بعد نہیں مہینوں کی مشقت برداشت کرکے سورت بندر پہنچے تھے اور وہاں سے جہاز کا سفر بھی نہ آسان تھا نہ خطروں سے خالی تھا۔ یہ سفر کسی معمولی عزم اور حوصلے کے آدمی کے بس کا نہ تھا۔ یہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی سی ہمت والے شخص کا کام تھا۔ وہی اس سفر میں کامیاب ہوئے۔

مکہ مکرمہ میں ان کی ہمت دشوار پسند نے عمل و خدمت کا ایک نیا میدان تلاش کیا یہ درس وتدریس کا میدان تھا لیکن اب ان پر صرف درس وتدریس علوم و فنون ہی کی ذمہ داری نہ تھی بلکہ ایک مدرسہ کے قیام اور اس کے اہتمام کی ذمہ داری بھی تھی جس کے لیے مدرسانہ صلاحیتوں کے علاوہ انتظامی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا پیمانہ سیرت یہاں بھی بہت اونچا رہا۔

سروسامان حیات اور اسباب راحت کی کسے ضرورت نہیں ہوتی۔ معاشرے میں عزت وتوقیر کی خواہش فطری امر ہے۔ اعزاز واکرام میں بھی قلب کے لئے کشش رہی ہے۔ پس اگر زمانہ عیش و راحت کے اسباب اور عزت و توقیر کی زندگی کسی کو اس کی عظمت و خدمات کے اعتراف میں پیش کرتا ہے اور وہ اسے قبول کرلیتا ہے تو یہ بات ایسی نہیں کہ اس پر انگلی اٹھائی جائے لیکن یہی بات بعض اوقات سیرت کے اجلے دامن کا ایک داغ بن جاتی ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی زندگی میں آزمائش کی یہ گھڑی بھی آچکی تھی۔ ترکی کے دوسرے سفر کے موقع پر ان کے سامنے مدرسہ صولتیہ کی ضروریات کے لئے سلطان ترکی نے ایک معقول ماہانہ امداد کی پیش کش کی لیکن ایک دینی تعلیمی ادارے کو حکومت وقت کے اثرات سے محفوظ رکھنے اور اسے سرکاری حیثیت سے متعارف نہ کرانے کی ضرورت اور اہمیت کا انہیں اندازہ تھا انہوں نے نہایت سلیقہ کے ساتھ دربار خلافت کی اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور جب قسطنطنیہ کے تیسرے اور آخری سفر کے موقع پر سلطان نے ان سے قسطنطنیہ کو مستقل طور پر اپنی جائے سکونت بنالینے اور معزز شاہی مہمان کی حیثیت سے قیام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اگرچہ ۷۲ سال کے ایک بوڑھے شخص کے لئے جس کے اعضاء مضمحل ہوچکے ہوں، جس کی بینائی خراب ہوچکی ہو،

جس کی صحت نے جواب دے دیا ہو ، اس پیش کش اور سلطان وقت کی خواہش میں بڑی کشش تھی لیکن جس شخصیت نے اپنی نوجوانی اور شباب کو حرص و آز اور ہر طرح کے لوث سے پاک رکھا ہو، بڑھاپے میں عیش و راحت کی کسی دعوت سے کیا متاثر ہو سکتا تھا۔ انہوں نے سلطان کی اس خواہش کو پورا کرنے سے معذرت کرلی اور فرمایا۔

"اعزا اور اقارب کو چھوڑ کر اور ترک وطن کر کے خدا کی پناہ میں اس کے در دانے پر آکر پڑا ہوں۔ وہی لاج رکھنے والا ہے۔ آخر وقت میں امیر المؤمنین کے دروازے پر مروں تو قیامت کے دن خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا"

یہ جواب مولانا رحمت اللہ علیہ الرحمہ کی عظمت سیرت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

مولانا مرحوم کی سیرت کے اور کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو میں متعدد واقعات و حوادث ہیں جن میں انکا جوہر سیرت نمودار ہوا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ مجلس اس سے زیادہ طول بیان کی متحمل ہو سکے گی۔

۲۲۔ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ کو جب کہ ان کی عمر پچھتر سال کی تھی مکہ مکرمہ میں انتقال فرمایا جنت المعلیٰ میں ان کی قبر ہے۔ ان کا انتقال محض ایک عالم دین، مدرس یا مناظر کا انتقال نہ تھا کہ بلکہ ایک مثالی سیرت کے اٹھ جانے اور دنیا کی نظروں سے اس سیرت کے چھپ جانے کا حادثہ تھا۔